لیے مٹھائی وٹھائی نہیں آتی ۔

گوداوری نے ترش رو ہو کر جواب دیا "تم لاتے ہی نہیں ۔ تو آئے کہاں سے، میرا کوئی نوکر بیٹھا ہے"۔

دیودت کے دل پر گوداوری نے ان سے کبھی ایسے لہجہ میں بات چیت نہیں کی تھی ۔ بولے آہستہ بولو جھنجھلانے کی تو میں نے کوئی بات نہیں کی ۔

گوداوری نے آنکھیں نیچی کر کے کہا ۔ مجھے تو جیسا آتا ہے ویسے بولتی ہوں ۔ دوسروں کی سی میٹھی چکنی باتیں کہاں سے لاؤں"؟

دیودت نے ذرا گرم ہو کر کہا ۔" آج کل مجھے تمہارے مزاج کا کچھ رنگ ہی نہیں ملتا ۔ بات بات پر الجھتی ہو"۔

گوداوری کا چہرہ غصہ کی آگ سے لال پیلا ہو گیا ۔ میٹھی تھی، کھڑی ہو گئی ۔ ہونٹ پھڑکنے لگے ۔ بولی" اب تمہیں میری کوئی بات اچھی نہ لگے گی ۔ اب تو سر سے پیروں تک مجھ میں عیب ہی عیب بھرے ہیں ۔ اب اور لوگ تمہاری مرضی کے مطابق کام کریں گے ، مجھ سے نہیں ہو سکتا ۔ یہ لو بندوق کی کنجی ۔ اپنے روپے پیسے سنبھال لو ۔ یہ آئے دن کی جھنجھٹ مجھ سے نہیں برداشت ہو سکتی ۔ جب تک نبھا نبھایا، اب نہیں نبھ سکتا ۔

پنڈت دیودت کو سکتہ سا ہو گیا ۔ جس شور و شر کا انہیں خدشہ تھا ۔ اس نے نہایت خوفناک صورت میں ان کے گھر میں قدم رکھا ۔ وہ اور کچھ نہ بول سکے اس وقت زیادہ بولنے سے بات بڑھنے کا اندیشہ تھا ۔ وہ باہر چلے آئے ، سوچنے لگے کہ میں نے گوداوری کے ساتھ ایسی کون سی بے عنوانی کی ہے ۔ جس کا یہ پھل مل رہا ہے ۔

ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ کہ گودا وری کے ہاتھ سے نکل کر گھر کا انتظام کیونکر ہو سکے گا۔ اس قلیل آمدنی میں وہ نہ جانے کون ساجگت کرتی تھی۔ اب ایشور کیسے پار لگائیں گے۔ کچھ نہیں اسے منانا پڑے گا۔ اور ہو ہی کیا سکتا ہے! گومتی کیا کرے گی؟ سارا بوجھ میرے سر پڑے گا، مانے گی تو مگر مشکل سے۔

مگر پنڈت جی کے یہ خیالات باطل نکلے۔ صندوق کی وہ کنجی زہریلی ناگن کی طرح وہیں آنگن میں تین دن تک پڑی رہتی۔ کسی کو اس کے نزدیک جانے کی جرات نہ ہوئی۔

چوتھے دن پنڈت جی نے گویا جان پر کھیل کر کنجی اٹھالی۔ اس وقت انہیں ایسا محسوس ہوا۔ گویا کسی نے ان کے سر پر پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ آرام طلب آدمیوں کو اپنے مقررہ راستے سے ایک تل بھر ہٹنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ پنڈت دیودت جانتے تھے۔ کہ میں اپنے دفتر کے باعث گھر کا انتظام نہیں کر سکتا تاہم ان سے اتنی ڈھٹائی نہ ہو سکی کہ وہ کنجی گومتی کو دے دیں۔ مگر یہ محض دکھاوا تھا کنجی دیکھنے کو پنڈت جی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ کام سب گومتی کو کرنا پڑتا تھا اس طرح خاندان پر حکومت کرنے کا آخری وسیلہ بھی گودا وری کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اہل خانہ کے نام کے ساتھ جو عزت اور وقار وابستہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس کنجی کے ساتھ چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے گھر کی مہری، اور پڑوس کی عورتوں کے برتاؤ میں فرق عیاں ہونے لگا۔ گودا وری اب معزول رانی تھی۔ جس کا اختیار صرف دوسروں کی ہمدردی پر رہ گیا تھا۔

(۴)

خانہ داری کے انتظام میں یہ تغیر ہوا۔ تبھی گوداوری کی عادات میں بھی ایک افسوس ناک تغیر آنے لگا۔ حسد دل میں رہنے والی [illegible] میں رات دن اسی خاندان کے چرچے رہتے۔ دیکھو تو دنیا کیسی مطلب [illegible] ہے۔ منسی نے زبردستی دوجا بنایا۔ جان بوجھ کر اپنے پیروں میں کلہاڑی [illegible] اپنے گہنے کپڑے تک اتار دیئے۔ مگر اب روتے روتے آنچل بھیگتا [illegible] تو سوت ہی ہے۔ شوہر نے بھی نظروں سے گرا دیا۔ بس اب لونڈی کی طرح [illegible] میں پڑی پڑی پیٹ جلایا کرے۔ یہ بھی کوئی جینا ہے؟

گوداوری یہ ہمدردانہ باتیں سنتی اور اس کی آتشِ حسد اور بھی تیز ہوتی۔ اسے اتنا نہ سوجھتا کہ یہ زبانی غمگساریاں زیادہ تر نفسِ انسانی ہی کی خباثت سے پیدا ہوتی ہیں۔

گوداوری کو جس امر کا پورا یقین تھا، اور پنڈت دیودت کو جس کا بڑا خوف تھا، وہ بات نہ ہوئی۔ خانہ داری کے معاملات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ ہاں تجربہ نہ ہونے کے باعث [illegible] کے انتظام [illegible] خرچ زیادہ پڑ جاتا تھا۔ مگر کام چلا جاتا تھا۔ [illegible] گوداوری کو [illegible] ڈھنگ نظر آتے تھے جس میں آگ [illegible] ہے۔ مگر آگ کی [illegible] وہ دل کو جلانے کے بدلے [illegible] تنگ کر دیتا ہے۔ [illegible] ہو جانے سے گوداوری کو [illegible] خوشی ہوتی ہے۔ [illegible] کسی دن آفتاب نظر نہ آتا۔ [illegible]

تیل کے اچار بگڑ گئے۔ گومتی کو ان چیزوں کو دھوپ میں رکھنے کا خیال نہ رہا۔ گودا وری نے یہ نقصانات دیکھے۔ مگر اسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ ہاں دو چار جلی کٹی باتیں سنانے کا موقعہ البتہ ہاتھ آ گیا۔ مالکن بننا ہی آتا ہے۔ یا مالکن کا کام کرنا بھی"۔

پنڈت دیودت کی عادات میں بھی ایک تبدیلی نظر آنے لگی۔ جب تک گودا وری اپنے حسنِ انتظام سے گھر کا کام کاج سنبھالے ہوئے تھی۔ تب تک انہیں کسی چیز کی کمی نہیں کھلی۔ یہاں تک کہ ترکاری سبزی وغیرہ کے لیے بھی انہیں بازار نہ جانا پڑتا۔ مگر اب گودا وری انہیں دن میں کئی کئی بار بازار جاتے دیکھتی ہے خانہ داری کا انتظام خراب ہونے کے باعث اکثر انہیں عین وقت پر بازار بھاگنا پڑتا ہے۔ گودا وری یہ سب کایا پلٹ دیکھتی۔ اور سنا سنا کے کہتی، یہی مہاراج ہیں۔ کہ ایک تنکا بھی نہ اٹھاتے تھے۔ اب دیکھتی ہوں سارے دن بازار میں ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنتی کہ میرے لکھنے پڑھنے میں ہرج ہوگا۔

گودا وری کو ایک بار اس کا ثبوت مل چکا تھا۔ کہ پنڈت جی خرید و فروخت کے معاملہ میں بہت ہوشیار نہیں۔ اسی لیے اسے جب کپڑوں کی ضرورت ہوتی، تو وہ اپنے پڑوس کے ایک لالہ صاحب سے منگوایا کرتی تھی۔ پنڈت جی کو یہ بات بھول سی گئی تھی۔ کہ گودا وری کو ساڑیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے سر سے تو جتنا بوجھ کوئی ہٹا دے۔ اتنا ہی اچھا تھا۔ خود بھی وہی کپڑے پہنتے جو گودا وری منگا کر دے دیتی۔ انہیں نت نئے فیشن اور نمونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر اب کپڑوں کے لیے بھی انہیں کو بازار جانا ہوتا۔ ایک بار گومتی کے

پاس ساڑیاں نہیں تھیں۔ پنڈت جی بازار گئے تو ایک بہت نفیس جوڑا لائے بزاز نے من مانے دام لیے۔ ادھار سودا لینے میں پنڈت جی کو مطلق پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ گومتی نے وہ جوڑا گوداوری کو دکھایا۔ گوداوری نے دیکھا، اور پھر منہ پھیر کر بولی۔ بھلا تم نے انہیں کپڑے لانا تو سکھا دیا۔ مجھے تو سولہ سال گزر گئے۔ ان کے ہاتھ کا لایا ہوا کپڑا خواب میں پہننا بھی نصیب نہ ہوا۔

ایسے واقعے گوداوری کی آتشِ حسد کو اور بھی زیادہ مشتعل کیا کرتے تھے جب تک اسے یقین تھا کہ پنڈت جی فطرتاً روکھے ہیں۔ تب تک اسے اطمینان تھا۔ مگر اب ان کی یہ نئی نئی امنگیں دیکھ کر اسے معلوم ہوا۔ کہ میں نے ہزار کوشش کرنے پر بھی جس محبت کو نہ پایا۔ اسے گومتی نے محض اپنے حسن سے جیت لیا۔ اُسے اب یقین ہوا کہ میں جسے سچی محبت سمجھتی تھی۔ وہ فی الواقع ابلہ فریبی تھی۔ وہ محبت نہ تھی۔ نری خود غرضی تھی۔

(۷)

اتفاق سے اسی زمانے میں گومتی بیمار پڑی۔ اٹھنے بیٹھنے کی سکت نہ رہی۔ گوداوری کھانا پکانے لگی۔ مگر اسے یقین نہ ہوا۔ کہ گومتی واقعی بیمار ہے وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے کھانا پکوانے کے لیے یہ سوانگ رچا گیا ہے۔ پڑوسنوں سے کہتی کہ لونڈی بننے میں اتنی ہی کسر تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔

پنڈت جی کو آج کل کھانا کھاتے وقت بھاگا بھاگ سی پڑ جاتی ہے معلوم نہیں، کیوں۔ وہ اکیلے گوداوری سے باتیں کرتے ڈرتے ہیں۔ جانے کیا لعن طعن کرنے لگے۔ اسی لیے کھانا کھاتے وقت وہ ڈرتے رہتے تھے۔ کہ کہیں وہ

منحوس گھڑی نہ آجائے۔ گودا وری اپنی تیز نگاہوں سے ان کی یہ حالت دیکھتی اور دل میں اینٹھ کر رہ جاتی۔ ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ بولی، کیا مجھ سے بولنے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ دیکھتی ہوں، کہیں تو رات رات بھر باتوں کا تار نہیں ٹوٹتا۔ پر میرے سامنے منہ نہ کھولنے کی بھی قسم کھالی ہے۔ گھر کا رنگ ڈھنگ، تو دیکھتے ہو نہ۔ اب تو سب کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے!

پنڈت جی نے سر نیچا کیے ہوئے جواب دیا۔ اُنھ جیسے چلتا ہے ویسے چلتا ہے اب اس فکر میں کیا اپنی جان دے دوں؟ جب تم یہی چاہتی ہو۔ کہ گھر مٹی میں مل جائے تو میرا کیا بس ہے۔

اس پر گودا وری نے کچھ سخت باتیں کیں۔ بات بڑھ گئی۔ پنڈت جی اٹھ آئے۔ گودا وری نے قسم دلا کر انہیں بٹھانا چاہا۔ مگر وہ نہ بیٹھے۔ تب اس نے رسوئیں اٹھا دیں۔ سارے گھر کو فاقہ کرنا پڑا۔ گومتی میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ بات چاہے کیسی بھی سخت کیوں نہ ہو وہ سہہ لیتی تھی۔ مگر بھوک کی برداشت اس سے نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لیے وہ کبھی برت (روزہ) نہ رکھتی تھی۔ ہاں بہت اصرار کرنے سے جنم اشٹمی رکھ لیتی تھی۔ لیکن آج کل بیماری کے باعث اسے اور بھی بھوک لگتی تھی۔ جب اس نے دیکھا، کہ دوپہر ہونے آئی، اور کھانا ملنے کی امید نہیں تو اس نے مجبور ہو کر بازار سے مٹھائی منگوائی۔ ممکن ہے، اس نے محض گودا وری کو جلانے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ کیونکہ کوئی بھی ایک وقت کے بھوکے رہنے سے مر نہیں جاتا گودا وری کے سر سے پیر تک آگ لگ گئی۔ اس نے بھی فوراً مٹھائی منگوائیں۔ اور آج کئی برس کے بعد خوب پیٹ بھر کے مٹھائی کھائی۔ یہ سب حسد

کے کرشمے ہیں۔

جو گوداوری دوپہر ہونے سے پہلے منہ میں پانی ڈالنا گناہ سمجھتی تھی وہی گوداوری اب روزانہ علی الصباح ناشتے کے بغیر بے قرار ہو جاتی ہے۔ سر میں وہ ہمیشہ میٹھا تیل ڈالتی تھی۔ اب میٹھے تیل سے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ پان کھانے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اُسے حسد نے نئی نویلی بہو بنا دیا۔

جنم اشٹمی کا مبارک دن آیا۔ پنڈت دیبودت کی خلقی مجبوریت ان دو تین دنوں کے لیے رخصت ہو جاتی تھی۔ وہ بڑے جوش سے اس کی تیاریاں کرتے تھے۔ گوداوری یہ برت بے آب و دانہ رکھتی تھی۔ اور پنڈت جی تو کرشن کے بھگت ہی تھے۔ ان کے لیے بے آب و دانہ رہنا لازمی تھا۔ ان کے اصرار سے اب کے گومتی نے بھی نرجل برت رکھنے کی جرأت کی۔ مگر اسے انتہا درجہ متعجب ہوا۔ جب ہری نے کہا۔ بڑی بہو برت نہ رکھیں گی۔ ان کے لیے بازار سے پوریاں منگوا دیتا۔

شام کے وقت گوداوری نے مان مندر جانے کے لیے یکہ کی فرمائش کی۔ گومتی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ مان مندر بالکل قریب تھا۔ اب یکے والے سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہ چڑھ کر بولی۔ فضول پیسے پھینکنے سے کیا فائدہ۔ مان مندر کون بڑی دور ہے۔ پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ فرمائش کر دینا آسان ہے۔ کھلتا ہے اس کو جو چھاتی پھاڑ کر کماتا ہے۔

تین سال پہلے گومتی نے اس طرح کی باتیں گوداوری کے منہ سے سنی تھیں آج گوداوری کو وہی باتیں اس کے منہ سے سننا پڑیں، دنوں کا پھیر!

گوداوری ان دنوں بڑی بے دلی سے کھانا بناتی تھی۔ پنڈت جی کے پرہیز کے

متعلق اسے اب پہلے کی سی احتیاط نہ تھی۔ ایک دن اس نے مہری سے کہا، کہ اندر سے مصالحے نکال کر پیش لا۔ مصالحے دال میں پڑے۔ تو دال ذرا تیز ہو گئی، مارے خوف کے پنڈت جی سے نہ کھائی گئی۔ اور آرام طلب آدمیوں کی طرح چٹپٹی چیزیں انہیں بھی مرغوب تھیں۔ لیکن مرض کے ہاتھوں مجبور تھے۔ گومتی نے جب یہ ماجرا سُنا۔ تو بھویں چڑھا کر بولی "کیا بڑھاپے میں زبان گز بھر کی ہو گئی ہے۔ کچھ اس طرح کی سخت باتیں پہلے گوداوری نے بھی کہی تھیں۔ آج اس کی سننے کی باری تھی۔ نیرنگی روزگار اسی کا نام ہے۔

(۸)

آج گوداوری گنگا سے ملنے آئی ہے۔ تین سال ہوئے، وہ ایک بار دولہا دُلہن کو لے کر گنگا کو دودھ چڑھانے آئی تھی۔ آج وہ اپنی جان اُسے نذر کرنے آئی ہے۔ آج وہ اس کی مسرت بار موجوں میں آرام کرنا چاہتی ہے۔

گوداوری کو اس گھر میں ایک ایک لمحہ رہنا شاق تھا جس گھر میں لونڈی بن کر رہنا اس جیسی خوددار عورت کے لیے محال تھا۔

اب اس گھر سے گوداوری کا تعلق صرف اس پرانی رسّی کی طرح تھا۔ جو بار بار گرہ دینے پر بھی کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ ہی جاتی ہے۔ اسے گنگا جی کے دامن میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ نظر آتی تھی۔

کئی دن ہوئے اس کے منہ سے بار بار جان دے دینے کی دھمکی سن کر پنڈت جی غصّے سے بول اُٹھے تھے۔ تم کسی طرح مر بھی تو جاتیں۔ گوداوری وہ زہریلے الفاظ اب تک نہ بھولی تھی یہ چبھنے والی باتیں اس کے دل پر پتھر کی لکیر بن جاتی تھیں۔ آج

گومتی نے بھی وہی باتیں کہیں۔ اگرچہ اس نے بہت کچھ سننے پر یہ الفاظ زبان سے نکالے تھے۔ مگر گودا وری کو اپنی باتیں تو بھول گئی تھیں۔ صرف گومتی کی باتیں کان میں گونج رہی تھیں۔ آہ! اور پنڈت جی نے اسے ڈانٹا تک نہیں۔ مجھ پر ایسا غضب ڈھایا جائے۔ اور وہ زبان تک نہ کھولیں۔

آج سب لوگوں کے چلے جانے پر گودا وری گھر سے باہر نکلی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ پانی کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔

محبت کی زنجیر کتنی مضبوط ہے۔ اور پھر کتنی نازک! نازک ہے۔ دغا کے سامنے مضبوط ہے۔ بیوگ کے سامنے، گودا وری چوکھٹ پر کھڑی کھڑی گھنٹوں روتی رہی۔ کتنی ہی پچھلی باتیں اسے یاد آتی تھیں۔ کبھی اسی گھر میں اس کے لیے محبت بھی تھی عزت بھی تھی۔ زندگی کا سکھ بھی تھا۔ مگر اب کیا ہے! فوراً پنڈت جی کی وہ دل خراش باتیں یاد آگئیں۔ آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ گودا وری گھر سے چل کھڑی ہوئی۔

اس وقت اگر پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے پاؤں، پانی میں بھیگتے، دوڑتے آتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گودا وری کو پکڑ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیتے اور کہتے "پیاری" اس کے سوا ان کی زبان سے اور کچھ نہ نکلتا۔ کیا تب بھی گودا وری اپنے ارادے پر قائم رہتی؟

کنوار کا مہینہ تھا۔ رات کو گنگا کی لہروں کی گرج بہت خوف ناک معلوم ہوتی ساتھ ہی یکایک بجلی کوند جاتی، تو اچھلتی ہوئی لہریں روشنی میں ایسی معلوم ہوتیں گویا روشنی خود مست ہاتھیوں کے جسم میں کلیلیں کر رہی ہے۔ نزاع ہستی کا ایک

خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے پھیلا ہُوا تھا۔

گوداوری کے سینے میں بھی اس وقت خیالات کی پُرشور لہریں اٹھتی تھیں۔ اور آپس میں ٹکراتی تھیں۔ کہاں؟ تاریکی میں جہاں کچھ نہیں تھا۔

کیا یہ گرجتے اُمڈنے والی گنگا گوداوری کے دلِ بے قرار کو تسکین دے سکتی ہے؟ اس کی لہروں سے نغمۂ شیریں کی صدائیں نہیں آتیں۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی جھلک نہیں ہے۔ وہ اس وقت غضبناک اور پرخروش ہیں۔

گوداوری کنارے پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے؟ کیا اب بھی اُسے یہ کھٹکا نہیں تھا۔ کہ پنڈت دیودت آتے نہ ہوں؟ پریم کی رسی کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

اسی تاریکی میں حسد اور ریاس اور بے مہری کے ہاتھوں ستائی ہوئی یہ دُکھیا گنگا کی گود میں گر پڑی۔ لہریں چاروں طرف جھپٹیں، اور اُسے نگل گئیں۔

سویرا ہوا گوداوری گھر میں نہیں تھی۔ اس کی چارپائی پر یہ خط پڑا ہوا تھا۔

"سوامی جی! دنیا میں آپ کے سوا اور میرا کون تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ آپ کے سکھ کی نظر کر دیا۔ اب آپ کا سکھ اسی میں ہے۔ کہ میں اس دنیا میں نہ رہوں اسی لیے یہ جان بھی اب آپ کی نذر ہے۔ مجھ سے جو کچھ خطائیں ہوئی ہوں۔ انہیں معاف کیجیے گا۔ ایشور آپ کو سدا سکھی رکھے۔" پنڈت جی اس خط کو پڑھتے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ گومتی رونے لگی۔ مگر معلوم نہیں کیا سوچ کر؟۔

سرِ پُرغرور

شام ہو گئی تھی۔ میں سرجو ندی کے کنارے اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا دریا کا لطف اُٹھا رہا تھا کہ میرے فٹ بال نے دبے پاؤں قریب آ کر مجھے سلام کیا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

"فٹ بال" کے نام سے جس مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ وہ میرا اردلی تھا۔ اسے صرف ایک نظر دیکھنے سے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ نام اس کے لیے کامل طور پر موزوں ہے۔ وہ سرتاپا ایک انسانی اور لحمی جرم تھا۔ عرض و طول مساوی۔ اس کا مُدوّر شکم جس نے اس دائرہ کے بنانے میں خاص حصّہ لیا تھا۔ ایک لمبے کمر بند میں لپٹا رہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ انتہا سے آگے نہ بڑھ جائے جس وقت وہ تیزی

سے چلتا تھا۔ نہیں بلکہ لڑھکتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فٹ بال ٹھوکر کھا کر لڑھکتا چلا آتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"کیا کہتے ہو؟"

اس پر فٹ بال نے ایسی ردنی صورت بنائی۔ گویا کہیں سے پٹ کر آیا ہے اور بولا۔ حضور ابھی تک یہاں رسد کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ زمیندار صاحب کہتے ہیں کہ میں کسی کا نوکر نہیں ہوں۔

میں نے اس نگاہ سے دیکھا۔ گویا میں اور زیادہ نہیں سننا چاہتا غیر ممکن تھا کہ ایک مجسٹریٹ کی شان میں زمیندار سے ایسی گستاخی سرزد ہوتی۔ یہ میرے حاکمانہ غصے کو مشتعل کرنے کی ایک بے تمیزانہ کوشش تھی۔ میں نے پوچھا "زمیندار کون ہے؟"

فٹ بال کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا "کنور سجن سنگھ۔ حضور بڑا سرکش آدمی ہے۔ رات ہونے آئی ہے اور ابھی تک حضور کے سلام کو بھی نہیں آیا۔ گھوڑوں کے سامنے نہ گھاس ہے۔ نہ دانہ لشکر کے سب آدمی بھوکے بیٹھے ہیں۔ مٹی کا ایک برتن بھی نہیں بھیجا۔

مجھے زمینداروں سے رات دن سابقہ رہتا تھا۔ مگر یہ شکایت کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس کے برعکس وہ میری خاطر و تواضع میں ایسی جانفشانی سے کام لیتے تھے۔ جو خودداری کے شایاں نہ تھی اس میں فیاضانہ مہمان نوازی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ نہ اس میں تکلف تھا

نہ نمودِ ثمر درشت۔ جو عیب ہے مگر سفلہ پن سے خالی۔ اس کے بجائے وہاں رسوخ بیجا کی فکر اور خود مطلبی کی ہوس صاف نظر آتی تھی اور اس رسوخ طلبی کی قیمت شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ان بے نواؤں سے وصول کی جاتی تھی۔ جن کا بیکسی کے سوا اور کوئی دستگیر نہیں۔ ان کے طرز کلام اور آداب میں وہ ملائمت اور عاجزی برتی جاتی تھی جن کا اعتبار حسن حسن ظن کے ساتھ بعید ہے اور اکثر ایسے موقعے آتے تھے جب ان خاطر داریوں سے تنگ ہو کر دل چاہتا تھا کہ کاش ان حریص اور خوشامدی آدمیوں کی صورت نہ دیکھنا پڑتی۔

مگر آج اپنے فٹ بال کی زبان سے یہ کیفیت سُن کر میری جو حالت ہوئی اس نے ثابت کر دیا کہ روزانہ خاطر داریاں اور شیریں کلامیاں مجھ پر بے اثر نہیں ہوئی تھیں۔ میں یہ حکم دینے ہی والا تھا۔ کہ کنور سجن سنگھ کو حاضر کرو کہ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ان مفت خورے چپڑاسیوں کے کہنے پر ایک معزز آدمی کو مطعون کرنا قرین انصاف نہیں۔ اردلی سے کہا۔ بنیوں کے پاس جاؤ۔ نقد دام دے کر چیزیں لاؤ اور یاد رکھو کہ میرے پاس کوئی شکایت نہ آئے۔

اردلی دل میں مجھے نفریں کرتا ہوا چلا گیا۔

مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب وہاں ایک ہفتہ تک مقیم رہنے پر بھی مجھے کنور صاحب سے نیاز نہ حاصل ہوا۔ اپنے عملوں اور لشکر والوں کی زبان سے کنور صاحب کی سرکشی اور غرور اور

ہیکٹری کی داستان میں روز سُنا کرتا اور میرے جہاندیدہ پیشکار نے ایسے نامہربان نواز گاؤں میں پڑاؤ ڈالنے کے لیے مجھے کئی بار کنایتًہ فہمائش کی۔ غالبًا میں پہلا شخص تھا جس سے یہ خطا سرزد ہوئی تھی اور اگر میں نے ضلع کے نقشے کے بجائے لشکر والوں سے اپنے دورہ کا پروگرام بنانے میں مدد لی ہوتی تو شاید اس ناگوار تجربہ کی نوبت نہ آتی لیکن کچھ عجیب بات تھی کہ کنور صاحب کی مذمت مجھ پر الٹا اثر ڈالتی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے اس شخص سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ہوا جو ہمہ گیر اور ہمہ کن افسروں سے اس قدر بے نیاز رہ سکتا ہے۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ گڈھی میں گیا۔ نیچے سرجو ندی لہریں مار رہی تھی۔ اس پار سانکھو کا جنگل تھا۔ میلوں تک بادامی ریت اس پر خربوزہ اور تربوز کی کیاریاں تھیں۔ زرد پھولوں سے لہراتی ہوئی بیگلوں اور مرغابیوں کے غول کے غول بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج دیوتا نے جنگلوں سے سر نکالا۔ لہریں جگمگائیں۔ پانی میں تارے نکلے۔ سہانا روح افزا منظر تھا۔

میں نے اطلاع کی اور کنور صاحب کے دیوان خانہ میں داخل ہوا وسیع کمرہ تھا۔ فرش سے آراستہ۔ سامنے مسند پر ایک نہایت قوی ہیکل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سر کے بال منڈے ہوئے گلے میں رودراکش کی ایک مالا۔ سرخ آنکھیں۔ اونچی پیشانی مردانہ غرور کی اس سے بہتر تصور نہیں

ہو سکتی۔ چہرہ سے ہیبت اور رعب برستا تھا۔
کنور صاحب نے میرے سلام کو اس انداز سے لیا۔ گویا وہ اس کے عادی ہیں۔ مسند سے اٹھ کر انہوں نے نہایت مربیانہ انداز سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ خیریت پوچھی۔ اور اس تکلیف کے لیے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد عطر پان کی تواضع کی۔ تب وہ مجھے اپنی گڑھی کی سیر کرانے چلے جس نے کسی زمانہ میں ضرور آصف الدولہ کو زچ کیا ہوگا۔ مگر اس وقت شکستہ حال تھی۔ یہاں کے ایک ایک روڑے پر کنور صاحب کو ناز تھا۔ ان کی خاندانی عظمت اور اقتدار کا تذکرہ۔ ان کی زبان سے سن کر باور نہ کرنا غیر ممکن تھا۔ ان کا طرز بیان یقین کو مجبور کرتا تھا اور وہ ان روایات کے محض پاسبان ہی نہ تھے بلکہ یہ ان کے ایمان کا جزو تھیں اور جس قدر ان کے امکان میں تھا۔ انہوں نے اپنی آن نبھانے میں کبھی فروگذاشت نہیں کی۔
کنور سجن سنگھ خاندانی رئیس تھے ان کا سلسلہ نسب جا بجا ٹوٹتا ہوا آخر کسی مہاتما رشی سے مل جاتا تھا۔ گو انہیں اب عبادت و ریاضت کا دعوے نہ تھا لیکن اس کا فخر ضرور تھا کہ وہ ایک رشی کی اولاد ہیں۔ بزرگوں کے جنگی کارنامے بھی ان کے لیے کچھ کم باعث فخر نہ تھے۔ ان کا تاریخ میں کہیں ذکر نہ ہو مگر خاندانی بھاٹ نے انہیں امر بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی اور اگر الفاظ میں کچھ طاقت ہے تو یہ گڑھی رہتاس یا کالنجر کے قلعوں پر بھی سبقت رکھتی تھی۔

کم سے کم قدامت اور پامالی کی ظاہری علامتوں میں تو اس کی مثال مشکل سے مل سکتی تھی۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں چاہے اس نے محاصروں اور سرنگوں کو حقیر سمجھا ہو۔ لیکن اس وقت وہ چیونٹیوں اور دیمکوں کے حملوں کی بھی مدافعت نہ کر سکتی تھی۔

کنور سجن سنگھ سے میری ملاقات بہت مختصر تھی لیکن اس دلچسپ انسان نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنالیا۔ نہایت ذکی، نکتہ سنج دور رس آدمی تھا جس سے اس کا بندۂ بے درم ہونا تھا۔

(۳)

برسات میں سرجوندی اسی زور شور سے چڑھی کہ ہزاروں گاؤں غارت ہو گئے۔ بڑے بڑے تناور درخت تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے تھے۔ چارپائیوں پر سوتے ہوئے بچے اور عورتیں۔ کھونٹے پر بندھے ہوئے گائے اور بیل۔ اس کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما گئے۔ کھیتوں میں ناؤ چلتی تھی۔

شہر میں اڑتی ہوئی خبریں پہنچیں۔ امداد کے ریزولیشن پاس ہوئے۔ سیکرٹریوں نے ہمدردی اور رنج کے ارجنٹ تار ضلع کے بڑے صاحب کی خدمت میں روانہ کیے۔ ٹاؤن ہال میں قومی ہمدردی کی پُرشور صدائیں بلند ہوئیں اور اس ہنگامے میں ستم رسیدوں کے پُر درد نالے دب گئے۔

سرکار کے کانوں میں فریاد پہنچی۔ ایک تحقیقاتی کمیشن تعینات

کی گئی۔ زمینداروں کو حکم ہوا کہ وہ کمیشن کے روبرو اپنے نقصانات کی تفصیل بیان کریں اور اس کے ثبوت دیں۔ شیورام پور کے مہاراجہ صاحب کو اس کمیشن کی صدارت کا منصب عطا ہوا۔ زمینداروں میں ریل پیل شروع ہوئی۔ نصیب جاگے۔ نقصان کے تخمینہ کے تصفیہ میں شاعرانہ سخن شناسی سے کام لینا پڑا۔ صبح سے شام تک کمیشن کے روبرو ایک جمگھٹ رہتا تھا۔ آنریبل مہاراجہ صاحب کو سانس لینے کی فرصت نہ تھی۔ دلیل اور شہادت کا کام سخن سازی اور خوشامد سے لیا جاتا تھا۔ مہینوں یہی کیفیت رہی۔ لب ساحل کے سب ہی زمیندار اپنے نقصان کی فردیں پیش کر گئے۔ اگر کوئی کمیشن سے بے فیض رہا تو وہ کنور سجن سنگھ تھے۔ ان کے سارے موضعے سرجو کے کنارے پر تھے اور سب تباہ ہو گئے تھے۔ گڑھی کی دیواریں بھی اس دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ مگر ان کی زبان خوشامد سے ناآشنا تھی۔ اور یہاں اس کے بغیر رسائی مشکل۔ چنانچہ وہ کمیشن کے روبرو صورت سوال بنے ہوئے نہ آسکے۔ میعاد ختم ہونے پر کمیشن نے رپورٹ پیش کی سیلاب میں ڈوبے ہوئے علاقوں میں لگان کی عام معافی ہو گئی۔ رپورٹ کے مطابق صرف سجن سنگھ ہی وہ خوش نصیب زمیندار تھے جن کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کنور صاحب نے رپورٹ سنی مگر پیشانی پر بل نہ آیا۔ اُن کے آسامی گڑھی کے صحن میں جمع تھے۔ یہ حکم سنا تو آہ وزاری کرنے لگے۔ تب کنور صاحب اٹھے اور بلند آواز سے بولے جمیرے

علاقے میں بھی معافی ہے۔ ایک کوڑی لگان نہ لیا جائے گا۔" میں نے یہ واقعہ سنا اور خود بخود میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بے شک یہ وہ شخص ہے جو حکومت اور اختیار کے طوفان میں جڑ سے اُکھڑ جائے مگر ختم نہ ہوگا۔

(۴)

وہ دن بھی یادگار رہے گا۔ جب اجودھیا میں ہمارے یادگار زندہ جاوید ٹیگور کو قوم کی جانب سے مبارکباد پیش کرنے کیلئے عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ہمارا مایۂ ناز۔ ہمارا پُرجوش۔ نازک بیان ٹیگور یورپ اور امریکہ پر اپنے کلام کا جادو کر کے واپس آیا تھا۔ اپنے کمالات پر ناز کرنے والے یورپ نے اس کی پرستش کی تھی۔ اس کے جذبات نے براؤننگ اور شیلے کے عاشقوں کو بھی پابند وفا نہ رہنے دیا۔ اُس کے آبِ حیات سے تشنہ کامان یورپ سیراب ہو گئے۔ ساری مہذب دنیا نے اس کی پرواز بلند کے آگے سر جھکا دیئے۔ اس نے بھارت کو یورپ کی نگاہوں میں اگر زیادہ نہیں تو یونان اور روم کے پہلو میں بٹھا دیا تھا۔

جب تک وہ یورپ میں رہا روزانہ اخبارات کے صفحات اُس کے تذکروں سے پُر ہوتے تھے۔ یونیورسٹیوں اور علماء کی انجمنوں نے اس پر خطابات کی موسلادھار بارش کر دی تھی۔ وہ تمغۂ امتیاز جو اہل یورپ کا پیارا خواب اور زندہ آرزو ہے۔ وہ تمغہ ہمارے پیارے

زندہ کن تشنکر کے سینہ پر زیب دے رہا تھا اور اس کی واپسی کے بعد آج انہیں قومی خدمات پر اظہار عقیدت کے لیے ہندوستان کے دل اور دماغ اجودھیا میں جمع تھے۔

اسی اجودھیا کی گود میں سری رام چندر کھیلے تھے اور یہیں انہوں نے والمیک کی سحر نگاریوں کی داد دی تھی۔ اسی اجودھیا میں ہم اپنے شیریں کلام تشنکر پر اپنی محبت کے پھول چڑھانے آئے تھے۔

اس قومی فرض میں حکام سرکاری بھی نہایت فیاضی کے ساتھ ہمارے شریک تھے۔ تشنکر نے شملہ اور دارجیلنگ کے فرشتوں کو بھی اجودھیا میں کھینچ لیا تھا۔ اجودھیا کو بہت انتظار کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔

جس وقت تشنکر نے وسیع شامیانہ میں قدم رکھا۔ ہمارے دل قومی فخر اور نشہ سے متوالے ہو گئے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ ہم اس وقت کسی زیادہ پاک۔ زیادہ روشن دنیا کے بسنے والے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے، افسوس صرف ایک لمحہ کے لیے۔ اپنی مصیبتوں اور بلاؤں کا خیال ہمارے دلوں سے دور ہو گیا۔ اچھے گیت [illegible] لوگوں نے ہمیں اس طرح مست کر دیا جیسے خوش نما راگ کو مست کر دیتا ہے۔

ایڈریس پڑھے جانے کا نمبر پہنچا [illegible] سارے پنڈال میں خاموشی کا عالم طاری تھا۔ جس وقت میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ "اے قوم کے رہنما! اسے ہماری رہنمائی کرو! ہم [illegible]

تمہیں مبارک باد دیتے ہیں۔ اور سچی ارادت سے تمہارے قدموں پر سر جھکاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یکایک میری نگاہ اٹھی اور میں نے ایک قوی ہیکل آدمی کو تعلقہ داروں کی صف سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا یہ کنور سجن تھے۔

مجھے کنور صاحب کی یہ بے موقع حرکت جسے بد تہذیبی خیال کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ بڑی معلوم ہوئی۔ ہزاروں آنکھیں ان کی طرف حیرت سے اٹھیں۔

جلسے کے ختم ہوتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا۔ وہ کنور صاحب سے اس امر کے متعلق جواب طلب کرنا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں صاحب! آپ کے پاس اس بے موقع فعل کا کیا جواب ہے"؟

سجن سنگھ نے متانت سے جواب دیا۔ "آپ سننا چاہیں تو دوں۔"

"شوق سے فرمائیے"۔

"اچھا تو سنئے"۔ "میں تنسکر کے کلام کا دلدادہ ہوں۔ تنسکر کی عزت کرتا ہوں۔ تنسکر پر ناز کرتا ہوں۔ تنسکر کو اپنا اور اپنی قوم کا محسن سمجھتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں اپنا روحانی گورو ماننے یا ان کے قدموں پر سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

میں حیرت سے ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ یہ انسان نہیں غرور کا